اورنگزیب یوسفزئی۔ ستمبر ۲۰۱۶

قرآن فہمی اور عربی زبان

ہماری منطقِ قیاسی کی بنیاد پر لکھی گئی تفاسیر کی روشنی میں

کیا فہمِ قرآن کے لیے عربی زبان و ادب میں مہارتِ تامہ لازمی ہے؟

ہمارے اساتذہ کے زمانے تک فہمِ قرآن کے اصولوں میں سے ایک بڑا اصول یہ مقرر کر دیا گیا تھا کہ عربی زبان بلکہ زمانۂ جاہلیہ کی زبان اور اس کے قدیم شعری ادب کے ذخیرے سے گہرا استفادہ کرنا بہت ضروری امر ہے۔ اور اس کی توثیق میں یہ بھی کہا گیا کہ زمخشری کی مشہور تفسیرِ کشاف کی تدوین میں یہی اصول کار فرما ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس علم سے قرآن کے لغوی مفہوم اور ادبی اسلوب پر کافی روشنی پڑتی ہے اور بہت سے الفاظ اور اصطلاحات کی تفہیم عرب محاورے کے مطابق مرتب کی جاسکتی ہے۔ لیکن اس کے برعکس یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج کی تحقیق کی رُو سے ہماری متوارث چلی آرہی تفاسیر میں ہمیں اس طریق کار کے اتباع کی مثالیں بہت کم ہی ملتی ہیں۔ اسی لیے تفسیروں کے ایک بے اندازہ ڈھیر میں سے صرف تفسیرِ کشاف ہی کی واحد مثال کیوں دی جاتی۔ تاہم یہ اصولِ تفہیم اس لحاظ سے بھی ناقص ہے کہ قرآن کا نزول ایک درست تصورِ کائنات اور انسان کو درپیش متنوع معاشرتی مسائل کے حل کے لئے ہوا تھا نہ کہ عربی زبان و بیان میں مہارتِ تامہ کے حصول کے لیے۔ قرآنِ حکیم کا موضوع تو انسانی معاشرہ کی طبقاتی ترکیب اور اس سے منطقی طور پر پیدا ہونے والے نتائج کا اس نقطۂ نظر سے مطالعہ کرنا تھا کہ یہ نتائج اللہ کی عام مخلوق کے لیے منفعت بخش ہیں یا کسی مخصوص گروہ کے غلبہ و استیلاء کو مضبوط کرتے ہیں۔ اور یہ نتائج فرد کے تزکیہ نفس کو کہاں تک ارتقاء دینے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں جس کی وجہ سے قربِ الٰہی کی منزل آسان ہوتی ہے، جو کہ حیاتِ انسانی کا منتہائے مقصود اور غایتِ کبری ہے۔

لیکن ظاہر ہے کہ ہماری تفاسیر میں مروجہ منطقِ قیاسی کی روشنی میں افراد کے اخلاقی کردار کی صحت کے اصولوں کا احاطہ، یا زبان کی گرامر اور اسلوب کا مطالعہ مذکورہ بالا مقاصد کے حصول کے سلسلہ میں کماحقہ روشنی نہیں ڈال سکتے۔ اس میں شک نہیں کہ لفظ اور معنی میں ایک نامیاتی رشتہ ہوتا ہے۔ ادب میں اسے صورت و معنی کا رشتہ کہا جاتا ہے اور فلسفہ میں جوہر [**substance**] اور عرض {**appearance**} کا۔ اس موضوع پر بڑی دقیق بحثیں کی جاچکی ہیں اور یہ آج ایک علیحدہ اور مکمل علمی میدان ہے۔ زبان، اس کی گرامر اور ذخیرۂ الفاظ ہر علم کے معانی کو واضح کرنے کے لیے کام میں ضرور لائے جاتے ہیں۔ لیکن اگر زبان کی ساخت، الفاظ کی نشست، اسلوبِ بیان، صنائع و بدائع اور فصاحت و بلاغت وغیرہ کو کسی علم کے جانچنے کا معیار قرار دے دیا جائے،،،، اور اس علم کے موضوع کے مافیہ {**content**} اور مغز کو نظر انداز کر دیا جائے، یا استخراجی منطق کی بھینٹ چڑھا کر غلط تعبیر کر لیا جائے، تو اس

رویہ سے کسی معاشرہ کی ترقی پذیر اور ابھرتی ہوئی حقیقت کی ترجمانی نہیں کی جاسکتی، بلکہ اس سے صرف کسی مخصوص معاشرہ کی مرتی ہوئی حقیقت کو بیان کیا جاسکتا ہے۔

لہذا حُسن، صداقت اور خیر جیسی مقصود اقدار کو معاشرتی حقیقت میں تحویل کرنا اور اس تحویل سے بدلتی ہوئی معاشرتی زندگی کے حقائق کو افراد کے ذہنوں تک پہنچانے کے بڑے مقصد کے لیے "زبان" کو ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ یہ بھی عیاں ہے کہ اس تبدیل شدہ معاشرتی شعور کی ترجمانی اور ترسیل کے لیے محقق کو اس کی ماخذ زبان اور اپنی زبان پر دسترس ہونی چاہیئے تاکہ وہ واضح اور روشن الفاظ میں اپنی بات سمجھا سکے۔ اس کے باوجود موضوع کے مقاصد و غایات کو اور اس کے اساسی نظریات اور بنیادی تعلیمات کے درست ادراک کو زبان، اسلوب اور الفاظ کی تراش خراش پر بہر حال فوقیت حاصل رہے گی۔

اس کی ایک مثال ہمارے سامنے موجود ہے کہ مارکسزم کی تعلیمات کو حاصل کرنے کے لیے عام طور پر جرمن زبان پڑھنے اور اس کے گرامر یا ادب میں غواصی کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی جو کہ اس نظریے کی ماخذ زبان ہے۔ ہر زبان میں تراجم نے اس ضرورت کو پورا کر دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر قوم نے مارکسی فلسفہ و تعلیمات کی غایات و مقاصد اور انہیں زندہ معاشرتی حقیقت میں تحویل کرنے کے طریقِ کار اور حکمتِ عملی کو اپنی زبان میں سمجھ کر پیش کرنے کی کوشش کی۔ پس ادراکِ حقیقت میں کامیاب رہے۔ اور اس منشور کو پارٹی جدوجہد کا محور قرار دے کر سیاسی انقلاب لانے کی تگ و دُو کی گئی۔ مگر قرآن حکیم کے مقاصد و غایات کو بیان کرنے اور انہیں حاصل کرنے کے منہاج کی وضاحت کی بجائے عربی زبان کے حصول اور اس کی باریکیوں کو سمجھنے پر سارا زور صرف کر دیا جاتا ہے اور یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ ایک ہزار برس قدیم علوم پر مشتمل درسِ نظامی کو پڑھے بغیر قرآنی تعلیمات کو سمجھنا اور ان کو زندہ معاشرتی حقیقت میں تحویل کرنے کے لیے جدوجہد کرنا ناممکن ہے۔ اس رویہ نے اسلامی فکر و عمل کے دائرہ کو انتہائی تنگ کر دیا ہے۔ بلکہ اسے اپاہج بنا دیا ہے۔

اسی ضمن میں قرآن حکیم کے مقاصد و مہمات اور اساسیات کو سمجھنے اور انہیں معاشرتی سطح پر حاصل کرنے کے لیے جس اہم مسئلہ کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے۔ وہ ہے "اعجازِ قرآن" کا مسئلہ۔ "اعجازِ قرآن" کے ثبوت میں عربی زبان کی فصاحت و بلاغت کو پیش کیا گیا ہے جس کا تعلق محض عرب قوم سے ہے۔ غیر عربی اقوام کے لیے قرآن حکیم کا اعجاز کبھی بھی عربی زبان قرار نہیں پا سکتا۔ اور یہ امر یقینی ہے کہ قرآن حکیم عربوں کے لیے نازل نہیں ہوا تھا بلکہ مختلف النوع زبانیں رکھنے والی تمام انسانیت کے لیے ہے۔ تو پھر کتاب کے اصل منشور کو ایک طرف چھوڑتے ہوئے کوئی بھی زبان کیسے اس کتاب کا اعجاز قرار دی جاسکتی ہے؟

خلافتِ راشدہ کی نظریاتی ریاست کی جگہ ملوکیت کی استحصالی حکومت قائم ہو جانے کی وجہ سے قرآنِ حکیم کے منشور کے وہ مقاصد و غایات ہی آنکھوں سے اوجھل ہو گئے جنہیں انسانیت کے گرد جہالت، افلاس، معاشی ناہمواری، استحصالِ محنت، جنسی تلذذ، توہم پرستی، ذہنی و جسمانی غلامی، عورت کی تذلیل اور زندگی کی بے مقصدیت کی شکل میں لپٹے ہوئے اصر و اغلال کو توڑنے کے لیے تلقین کیا گیا تھا۔

دراصل قرآنِ حکیم کا اعجاز عربی زبان نہیں بلکہ اس کے یہی بلند معاشرتی، نفسیاتی، فکری اور کائناتی حقائق تھے، جن سے اس عہد کا یونانی فلسفہ، رواقی عقلیت، ایران وہند کے مذاہب اور رہبانیت کے مسالک سب تہی دامن تھے۔ اور اس تہی دامنی کی وجہ سے وہ دامنِ انسانیت کے چاک رفو کرنے سے قاصر تھے۔ مگر افسوس ہے کہ قرآنی اعجاز صرف عربی زبان کی فنی باریکیوں کو قرار دے کر کئی صدیوں تک مسلم ذہن کو اس غیر معاشرتی مسئلہ کے حصول میں مشغول کر دیا گیا۔ عربی زبان وادب اور گرامر میں کامل مہارت کو قرآنی فہم کی ایک مشکل الحصول شرط اور ایک قطعی پیشگی اہلیت کا درجہ دے دیا گیا کہ جس میں یدِ طولی حاصل کیے بغیر قرآن فہمی کا تصور ہی باطل تھا۔ دراصل یہ بھی نسلی تفوق پر زور دینے کا ایک ذریعہ تھا۔ اور علمائے یہود کے اتباع میں قرآن فہمی کا میدان ایک محدود طبقہِ عالیہ کی اجارہ داری کے سپرد کر دینا تھا۔

کسی علم پر پورا عبور حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی اصطلاحات کے مفہوم کو پوری طرح سمجھ لیا جائے۔ جب تک علم کی اس شاخ کی جس کا مطالعہ مقصود ہوتا ہے، اصطلاحات اور غرض وغایت کو پوری طرح سمجھ نہ لیا جائے، اس کا مطالعہ علمی نہیں کہلا سکتا، کیونکہ اس صورت میں ابہام اور التباسات اپنے سائے ڈالتے رہتے ہیں۔ اسی طرح اصطلاحات کا قطعی مفہوم سمجھنے کے لیے اس عمل کا مطالعہ لازمی ہوتا ہے جس عمل کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے یہ اصطلاحات وضع کی جاتی ہیں۔ ہر علمی اصطلاح مخصوص عمل سے تخلیق پاتی ہے۔ مثلاً معاشیات کی اصطلاح طلب ورسد کو اگر سمجھنا چاہیں تو مارکیٹ میں اس معاشی عمل کا مطالعہ لازمی ہوتا ہے جس میں اشیاء کی طلب و رسد سے معاملہ پڑتا ہے۔ اس اصطلاح کو اس معاشی عمل سے علیحدہ کر کے طوطے کی طرح رٹ لینے سے اس کے پورے مفہوم پر حاوی نہیں ہوا جا سکتا جس عمل کے تقاضوں اور ضروریات کو متعین کرنے کے لیے یہ وضع ہوئی تھی۔

اسی طرح قرآن حکیم کی اصطلاحات، جیسے کافر، فاسق، مومن، مسلم، صلوۃ، زکوۃ، ازواج، بنات، مومنات، محصنات، مسافحات، بیوت، نکاح، ماملکت ایمانکم، وغیرہ کا مفہوم بھی اُس وقت تک متعین نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس عمل کا معروضی مادی حقائق اور بنیادی قرآنی نظریے کی روشنی میں پوری تفصیل سے مطالعہ نہ کیا جائے جس کے تقاضوں اور ضروریات نے ان اصطلاحات کو وضع کرنے میں مدد دی ہے۔

یہ بھی نوٹ کرنے کا نکتہ ہے کہ قرآنی اصطلاحات کا بہت بڑا حصہ مکی جدوجہد میں وضع ہوا جہاں اسلامی تحریک اور اس کے مخالفین کے درمیان شدید تصادم ہو رہا تھا۔ مدینہ کی سوسائٹی میں منافقین کے کیریکٹر کی وجہ سے منافق کی اصطلاح وضع ہوئی۔ اس کے علاوہ سرایا اور باقاعدہ جنگوں کی وجہ سے تقسیمِ وراثت، نکاح وطلاق کے مسائل، یتامی کی پرورش، قیدیوں کی آمد کی وجہ سے بہت سی اصطلاحات کی تدوین عمل میں آئی۔ اگرچہ یہ تمام اصطلاحات وحی الٰہی کے ذریعہ نازل ہوئیں مگر وحی الٰہی کے نزول کا تقاضا بھی عمل سے ہی ماخوذ تھا۔ یعنی وحی الٰہی معاشرہ کی ضروریات کی تکمیل کے لئے نازل ہوتی تھی۔

مفسرین حضرات نے اصطلاحاتِ قرآن کو قرآن کے اساسی منشور سے، ان کے عملی تقاضوں سے اور معاشرتی حوالے [**social perspective**] سے، تاریخی پسِ منظر سے الگ کر کے صرف ایک روزمرہ کی عامیانہ زبان سے سمجھنے کی کوشش کی جس سے

نتیجہ یہ نکلا کہ اصطلاح کے حقیقی مفہوم کو سمجھنے کی بجائے اپنا وضع کردہ مفہوم اس کی تفہیم میں شامل کر دیا۔ یہاں تک خود اپنا مقرر کردہ عربی زبان وادب کے بلند اسلوب سے استفادے کا اصول تک فراموش کر دیا۔ یہاں سے ہمیں اس بات کا کافی وشافی ثبوت بھی ملتا ہے کہ ملوکیت کی ابتدائی صدیوں سے لکھی جانے والی تمام تفاسیر ایک ماقبل سے متعین شدہ حکومتی ایجنڈے کے تحت مدون کی گئیں۔ اور پھر سرکاری سرپرستی ہی میں یہ سلسلہ دراز ہوتا ہوا ارادی طور پر اور بعد ازاں غیر ارادی یا تقلیدی طور پر جاری رہا اور بالآخر کم وبیش اُسی قدیمی شکل وصورت میں دورِ حاضر تک آ پہنچا۔

یوں بھی تفسیر نویسی اپنی اصل میں قرآن کی فہم کا طریقہ نہیں بلکہ اُس کی فلاسفی کو مسخ کرنے کا ایک ملوکیتی حربہ تھا کیونکہ قرآن بقولِ خود ایک تفسیر، تشریح، تفصیل شدہ اور کھول کر بیان کردہ الہامی وثیقہ تھا جس کی کوئی بھی انسانی ذہن خود اُس کی اپنی تحریر سے بہتر انداز میں وضاحت نہیں کر سکتا تھا۔

قرآن کے اس قولِ فیصل کی روشنی میں تفسیر نویسی ایک حدود فراموشی کے جرم کی صورت ہمارے سامنے آتی ہے۔ کیونکہ اس جرم کے ضمن میں بہت بڑے بڑے محترم نام اور ایک ہمالیہ کی چوٹی کے بقدر بلند اور مقدس تفسیری مواد ہمارے سامنے آجاتے ہیں، اس لیے ہم فی الحال اس موضوع پر خاموشی اختیار کیے لیتے ہیں کیونکہ اس مقام پر یہ ہمارا موضوع نہیں۔ البتہ تفسیر نویسی پر خالص قرآنی نصوص کی روشنی میں ایک مستند تحقیقی مقالہ جلد ہی قارئین کے غور وفکر کے لیے پیش کر دیا جائیگا۔

آپ پر سلامتی ہو۔